

Article

The Historical Perspective of Women in Harem and Kai Chand Thy Sare Aasmaan

عورت، حرم اور کئی چاند تھے سر آسماں: تاریخی تناظر

Sumaira Umar

Assistant Professor Urdu, Government Shalimar College, Baghbanpura, Lahore

Correspondence:

سمیرا عمر

اسسٹنٹ پروفیسر اردو، گورنمنٹ شالیمار کالج، باغبانپورہ لاہور

eISSN: 2707-6229

pISSN: 2707-6210

DOI: <https://doi.org/10.56276/7t69xx32>

Received: 11-06-2024

Accepted: 08-07-2024

Online: 10-07-2024



Copyright: © 2023
by the authors.

This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Commons Attribution (CC BY) license

ABSTRACT: The concept of a harem is associated with monarchy. The practice of harem has existed in the ancient kingdoms of the world. In the Mughal harem, there was a ranking system for women; the rank of the Sultan's mother came first, followed by the first wife. Other wives were generally called Begums. After them came the status of Khwases or courtesans, and lastly the concubines who were in the service of Begums and mistresses. Among the Mughals, free women were also admitted to the harem due to their skill in music, dance, arts or etiquette. Later, nobles and Nawabs also started decorating their Harems. Seeing these Nawabs and nobles, the Britishers also started keeping native women as harem in their palaces, but the purpose of harem women was only to fulfil their sexual desires.

KEYWORDS: Monarchy, Harem, History, Wives, Courtesan, Concubine, Mistress, Nobles and Urdu Novel

تاریخ تہذیب و تمدن کا ایسا آئینہ ہے جس میں انسانیت کے خدوخال اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ بڑی صراحت کے ساتھ اجاگر ہوتے ہیں۔ اقوام کی اجتماعی زندگی میں اقدار کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے انہیں کی بنا پر اقوام و ملل کے عروج و زوال کا راستہ طے ہوتا ہے۔ ماضی کے مذہبی سیاسی، معاشی، جغرافیائی سماجی اور معاشرتی واقعات و حالات سے افراد کے باہمی تعلق و اجتماعی زندگی سے اخذ شدہ جامع تصویر سامنے رکھ کر ہی حقیقت کے رخ سے پردہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ تاریخ جہاں حضرت انسان کے کاروانِ زندگی کی روداد سفر بیان کرتی ہے وہیں یہ ثقافتی و تہذیبی عوامل کو بے نقاب کر کے ماضی، حال اور مستقبل کے تعلق کو استوار کرتی ہے یہ بات حقیقت ہے کہ لکھے گئے لفظ کی عمر بولے گئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ ہی وجہ ہے ہزاروں سال کا سفر طے کرنے کے بعد بھی لکھا گیا لفظ خود پر گزری پتہ سنانے اہلیت رکھتا ہے تاریخی کتب پر نظر دوڑائیں تو اس "تاریخ میں عورتیں تقریباً غائب ہیں اور اگر ان کا ذکر ہے بھی تو مالِ غنیمت میں صلح کے لیے ان کو بطور تحفہ دینے اور مردوں کی تابعداری کرنے کا ہے جن چند عورتوں کا ذکر ہے تو وہ اس طرح کہ وہ اقتدار کے بعد اپنی نسوانیت ختم کر کے مردوں کی طرح ہو گئیں۔" جب کہ دوسری جانب شریعی متون اور آئین شاہان میں عورت ایک مکمل حیثیت کے ساتھ کچھ حقوق اور زیادہ سے فرائض اپنے ذمے لیے کھڑی ملتی ہیں۔ ذیل میں دو شریعی متون اور دو آئین شاہی کی مثالیں ثابت کرتی ہیں کہ عورت کے لیے مکمل ضابطہ حیات موجود ہے لیکن پیشتر تاریخ کتب ان کے تذکرے سے خالی ہیں۔

دنیا کا قدیم ترین دستیاب شدہ قانون حمورابی کا ہے جو بابلی حکمران تھا۔ ۱۲ اس قانون میں بابل کی آزاد عورت، لونڈی اور داشتہ کے لیے الگ الگ احکامات موجود ہیں۔ قانون حمورابی میں آزاد عورت یا بیوی کے حقوق اور تعزیرات کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے مثلاً نکاح، زنا، زنا بالجبر لعان، اور ناجائز تہمت کے باب میں احکامات موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ قیدی کی بیوی، بھگوڑے کی بیوی، عیاش بیوی، بانجھ بیوی، بیمار بیوی، پجارن بیوی، اور رہن میں رکھی گئی بیوی سے متعلق احکامات موجود ہیں۔ اس قانون نے داشتہ کے حقوق کی بابت قوانین وضع کیے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسی لونڈیاں جو مالک کے خلاف ہوں یا سرکش ہو جائیں یا رہن میں رکھ دی جائیں یا کسی ام الولد کو فروخت کر دیا جائے یا بیوی اپنی لونڈی کو شوہر کو پیش کر دے اور وہ صاحبِ اولاد ہو جائے تو اس ضمن میں بھی الگ فیصلے سنائے گئے ہیں مثلاً احکام نمبر ۱۴۶ کے مطابق:

’اگر کوئی شخص کسی پچارن سے نکاح کرے اور وہ اپنے خاوند کو ایک لونڈی پیش کرے جس سے اس کے اولاد پیدا ہو جائے اگر بعد کو یہ لونڈی اپنی مالکن سے برابری کا دعویٰ کرنے لگے تو چوں کہ وہ بچوں کی ماں ہے اس کی مالکن اسے چاندی کے عوض میں فروخت نہیں کر سکتی ہاں

بیڑی پہنائی جاسکتی ہے اور اس سے لونڈی غلاموں کا سا سلوک کیا جائے اگر اس لونڈی کے اولاد نہ ہو تو اس کی مالکہ اسے چاندی کے عوض فروخت کر سکتی ہے۔ ۳۴

تورات کی کتاب پیدائش میں بھی لونڈی اور مالکن کے درمیان برابری کرنے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ لونڈی کے ام الولد ہونے سے اس کا مرتبہ بدل جاتا ہے اور وہ مالکن سے ہمسری کرنے لگتی ہے۔ یوں آزاد بیوی اور لونڈی کے درمیان حسد و رقابت کا جذبہ نپٹتا ہے۔ اسی طرح آزاد کنواری لڑکی کے بارے میں بھی احکام ہے کہ اگر کوئی شخص کنواری کے ساتھ زنا کرے گا تو اسے مہر کی قیمت ادا کر کے اس کی شادی کرے گا لیکن اگر لڑکی کا باپ اس شادی پر راضی نہ ہو تو کنواری کے مہر کے موافق اسے نقدی دی جائے گی۔ باپ کے لیے بھی بیٹی کے بارے میں خصوصی طور پر حکم ہے کہ ”تو اپنی بیٹی کو کسی بنا کر ناپاک نہ ہونے دینا تاکہ ایسا نہ ہو کہ ملک میں رنڈی بازی پھیل جائے اور سارا ملک بدکاری سے بھر جائے۔“ اسی باب میں عورتوں کی حرمت کا بیان ہے جس میں تمام خونی رشتوں کے ساتھ ساتھ ہمسائے کی عورت، بہو، ساس اور سالی کی حرمت کا بھی بیان ہے۔ بیوی کے حقوق کے بارے میں واضح احکامات کتاب ملاکی میں ملتے ہیں کہ پہلی بیوی کا مرتبہ سب سے مقدم اور سب پر مسلم ہے۔ خدا نے یہود سے ناراضی کا اس لیے اظہار کیا کہ اس نے اپنے باپ دادا سے بے وفائی کی اور اسرائیل کو ویر و شلم کی قدر و قیمت کو بے حرمت کیا کیوں کہ وہ بیوی کی موجودگی میں ایک غیر معبود کی لڑکی کو بیاہ لایا اس غلطی کے عوض خدا نے تو اس کی آہ و زاریاں قبول کرے گا نہ ہدیہ و فدیہ قبول فرمائے گا۔ یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ بنی اسرائیل کو یک زوجگی کا حکم ہے یہاں کثیر زوجگی کا رواج تھا۔ حضرت یوسف کے والد یعقوب کی دو بیویاں لیاہ اور راحل تھیں، سموئیل کے والد القانہ کی بھی دو بیویاں حنہ اور فنثہ تھیں اسی طرح سیلمان کے والد داؤد کی دو بیویاں ابھیمل اور اخینوم تھیں جن کی آپسی حسد و رقابت کا ذکر آیا ہے۔ اسی لیے یہاں سماجی طور پر پہلی بیوی کے بلند مرتبہ ہونے کی بابت بات کی گئی ہے۔

قدیم ہندوستان میں ویدک عہد کے بعد راجہ اشوک کے دانا وزیر نے راجا کے لیے مجموعہ قانون وضع کیا۔ جس میں ہندوؤں کے ہاں موجود بیاہ کے قواعد و ضوابط کو تسلیم کرتے ہوئے عائلی قوانین کے لیے الگ سے باب مختص کیا ہے۔ اس باب میں ازدواج، ازدواجی ذمے داریاں اور عورت کی املاک پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہندومت میں شادی بیاہ کی مختلف صورتوں اور شادیوں کی رسومات میں اصلاحات کی گئی ہیں۔ کنیادان، دوسری شادی، بیواؤں کے لیے آبرو منداندہ زندگی گزارنے کے راستے اور وسیلے، دوسری شادی کی مختلف صورتیں اور شرطیں مثلاً بیماری، بانچھ پن، اور اولاد زینہ نہ پیدا کرنے کی صورت میں مرد کے لیے دوسری شادی کی اجازت، بیویوں کے فرائض، عورت کا نان و نفقہ اور عورتوں پر ظلم و ستم کی ممانعت کے احکامات بھی موجود

ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ میاں بیوی میں عداوت، نازیبا حرکات، سرکشی و آوارگی اور ازدواجی معاہدے بھی مباحث میں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں مرد اور عورت کی مورثی املاک کے متعلق بھی قوانین سازی کے تحت وراثت کی تقسیم میں خصوصی طور پر بیاہتا، غیر بیاہتا، اپنی گوت، دوسری گوت، منہ بولی اولاد، خرید گیا بیٹا، برہمن اور کھتری کی اپنی ذات کی عورت سے اولاد اور نچلی ذات کی عورتوں سے اولاد کے حصے اور تر کے کو بیان میں شامل کیا گیا ہے۔^۷

قرآن مجید میں بھی آزاد عورت اور لونڈیوں کے حقوق کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے۔ قرآن مجید نے آزاد مرد کے لیے آزاد عورت یعنی بیوی کو اس کی کھیتی قرار دیا۔ جس طرح کسان اپنی کھیتی سے نفع حاصل کرتا ہے اور اس سے پیوستہ رہتا ہے اسی طرح مرد بھی اپنی عورت سے اولاد اور تسکین کی صورت نفع پاتا ہے مگر اس نفع کے لیے اسے علی الاعلان قانونی طور پر رشتہ ازدواج میں باندھنے اور مہر ادا کرنے کا حکم دیتا ہے۔ مہر کی قیمت مرد کی معاشی حیثیت کے مطابق قرار پائی۔ اسلام میں عارضی و پوشیدہ تعلقات اور زناشوئی کی گنجائش نہیں ہے۔ اسی لیے نکاح (بہ استثنیٰ و اختلاف نکاح متعہ و نکاح مسیار) کے علاوہ کسی بھی قسم کے تعلق زن و شو کی صورت میں حدود بھی مقرر کر دی ہیں البتہ مردوں کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ بیک وقت دو دو تین تین، چار چار آزاد عورتوں سے نکاح کر سکتے ہیں، مگر ساتھ ہی محرمات سے مناکحت کی پابندی بھی عائد کر دی گئی۔ البتہ لونڈیوں کو اپنے تصرف میں لانے کا اختیار دیا گیا اور اس میں تعداد کی بھی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی۔

اسلام کی آمد سے لے کر خلافت راشدہ تک اسلامی حکومت شریعت کے اصولوں پر عمل پیرا رہی۔ اس کا مقصد جہاں گیری و جہاں بانی نہیں تھا مگر جب اموی دور آیا تو اسلامی طرز حکمرانی میں انقلاب برپا ہوا۔ صرف حکمران اور طرز حکومت میں نہیں بدلا بلکہ خلافت کے نظام کو ملوکیت میں تبدیل کر دیا گیا۔ اصل اختیارات قانون کی بجائے بادشاہ کو منتقل ہو گئے اور سلطان کا حکم ہی حکم آخر ٹھہرا۔ شریعت کے احکام و قواعد کی پابندی کی جاتی نہ عوام الناس یا سماجی مساوات کا تصور پنپنے دیا جاتا۔ بیت المال امت مسلمہ کی بجائے بادشاہ کا خزانہ عامرہ بن گیا جس کی آمد و خرچ کی بابت کوئی بادشاہ سے محاسبہ کرنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ اموی خلفاء کے بعد عباسیوں کا دور آیا تو سبھی نے (بہ استثناء عمر بن عبدالعزیز) طریقہ بادشاہی ایک سار کھا۔ بہ قول مولانا ابوالاعلیٰ مودودی "بنی امیہ کے لیے قسطنطنیہ کے قیصر نمونہ تھے تو عباسی خلفاء کے لیے کسریٰ کے۔"^۸

مسلم طرز زندگی میں بادشاہت کے تصورات و نظریات شام و عراق، روم و مصر اور ایران کی فتوحات کے بعد شامل ہونا شروع ہوئے ان ممالک میں بازنطینی و ایرانی بادشاہ برسر اقتدار رہے جو جو اسلامی فتوحات کا سلسلہ بڑھتا گیا، توں توں خلافت راشدہ کا چلن کم ہوتا گیا۔ اموی خلفائے کسی نہ کسی طور خلافت کی روایت کا بھرم رکھا کیونکہ عربی النسل تفاقران میں موجود تھا۔ مگر

عباسی خلفائے ایرانیوں کی طرز پر بادشاہت کے نظریے کو مسلسل فروغ دیا۔ بقول ڈاکٹر مبارک علی زرتشت سے اسلام قبول کرنے والوں کا مقصد تھا کہ "ایرانی تصور بادشاہت و ایرانی انتظامی ادارے اور ایرانی درباری رسومات کو دوبارہ سے ان خود مختار بادشاہوں کے دربار میں رواج دیا جائے اسی وجہ سے شاہی خطابات، آداب کی رسومات، جلوس انعامات دینے کا دستور "راج ہوا۔"⁹

عباسی دور میں ہی باقاعدہ حرم کا آغاز ہوا۔ یہ حرم باز نطنی و ایرانی طرز پر سجائے جانے لگے۔ اور ان حرموں میں عرب، فارسی، ترک منگول، عبرانی، رومی، مغربی اور افغانی نسل کی خواتین جمع ہونے لگیں۔ جب مسلم خلفاء کے ہاں سے اسلامی روح ختم ہوئی تو ان کی نظر عورت کے جسم پر مرکوز ہو گئی انہیں رجھانے کے لئے کنیزوں کو درآمد کیا گیا جس سے "بردہ فروشوں کا گروہ پیدا ہو گیا جو ترکیہ، صقلیہ، ہندستان آرمینیا، روم اور افریقہ سے نوجوان لڑکیاں لاتا اور بغداد میں فروخت کرتا تھا، ان کی سب سے بڑی مارکیٹ کا نام سوق "الرفیق تھا"۔"¹⁰

ان ممالک کی کنیزیں حسن و خوبی کے لحاظ سے الگ الگ درجوں میں رکھی جاتیں، اسی بازار کا ایک حصہ نئی آمد شدہ کنیزوں کے لیے مخصوص ہوتا۔ انھیں بنا ہار سنگھار، کھلے بالوں کے ساتھ عریاں حالت میں لایا جاتا تھا کہ خریدار فطری حسن کا جائزہ لے سکیں۔ مختلف تاجران کی ظاہری صورت کی قیمت چکاتے اور تعلیم تربیت کے لئے کوشاں ہو جاتے تاکہ وہ فن میں پختہ ہو جائیں اور ان کے اچھے دام مل سکیں۔ بغداد میں ان تربیت یافتہ خواتین کو "جاریہ / جواری" کہا جانے لگا۔ اکثر موسیقار، رقاصائیں، عالمہ، فاضلہ، شاعرہ اور مدبر عورتیں ان کنیزوں ہی میں سے ہوئی ہیں، ان کے بطن سے حکمران اور امراء بھی پیدا ہوئے ہیں۔ "اسقوط بغداد کے سلاطین عثمانیہ کا عروج ہوا اور یہاں باقاعدہ نکاح کا رواج نہیں رہا وہ اپنی مملوکہ خواتین سے ہی اولاد پیدا کرتے اور انہیں ولی عہدی سونپتے۔"¹¹

حرم سجانے اور بسانے کا تصور قدیم ایران و یونان اور باز نطنیوں میں صدیوں سے رائج تھا۔ لیلی احمد کے مطابق سکندر نے فتح ایران کے بعد اپنے حرم کو بہت وسعت دی۔ جو غالباً مفتوح حکمران کی بیروی ہو سکتی ہے۔ اس کے حرم میں خواجہ سراؤں کو بھی عورتوں کی طرح استعمال کیا جاتا تھا؟ ابتدائی عیسوی صدیوں کے دوران عورتوں کی خانہ نشینی کی رسم فن تعمیر میں بھی در آئی جیسا کہ جائے رہائش میں عورتوں کے لیے علیحدہ عمارت کا حصہ (خواجہ سراؤں کی حفاظت کے ساتھ) پردے اور عورتوں کے مکمل ستر کے رویے، بحیرہ روم کے مشرق وسطیٰ عراق اور ایران میں اعلیٰ طبقوں کی زندگی کا حصہ بن گئے۔"¹²

قدیم یونان میں بھی خواتین کی خانہ نشینی کا تصور تھا۔ آزاد خواتین یا بیویاں پردے میں رہتی تھیں جب کہ مردوں سے اپنی تمام تر دلفریبیوں کے ساتھ کھلے بندوں ملنے اور ان سے علم و ادب پر گفتگو کرنے کے لیے باہر والیاں / داشتائیں ہوا کرتی تھیں۔

"یونان میں جنس نسواں کو دو بالکل مختلف طبقتوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک گھر والیاں، جو شوہروں کی حد درجہ وفادار بیویاں تھیں دوسرے باہر والیاں جو آشنائی کرتی پھرتی تھیں۔ گھر والیاں سخت پردے کے اندر رہتی تھیں اور عموماً بہت کم سنی میں بیابھی جاتی تھیں ان کے لیے مکان کا ایک پردہ دار حصہ مخصوص ہوتا تھا۔" ۱۴

قدیم ہندوستان میں بھی شاہی حرم کا تصور موجود تھا۔ کوٹلیہ نے راجا کے لیے قانون وضع کیا کہ وہ علاقے کے کسی اونچے ٹیلے پر اپنا محل بنائے۔ جس میں رانیوں کی رہائش گاہیں الگ سے تعمیر ہوں جن کی حفاظت خواجہ سراؤں کے مسلح دستے کے ذمے ہو، جو اس بات کو یقینی بنائیں کہ راجا کے علاوہ ان رانیوں سے کوئی باہر والا نہ ملنے پائے یہاں تک کہ راجا بھی غیر مصدقہ اطلاعات کے بغیر حرم میں داخل نہ ہو۔ راجا کی مسرت اور رانیوں کی ضرورت کا تمام سامان ہم وقت مہیا ہو۔ یہاں تک بیسواکس اشان سے پاک صاف ہونے اور نئے کپڑے اور زیورات سے خود کو سجانے سنوارے کے بعد راجہ کے پاس جائیں ۱۵

اسرائیلی روایات میں بھی حرم کا تصور بادشاہی سے جوڑا گیا ہے۔ جب تک بنی اسرائیل قبائل کی شکل میں تھے کثیر زوجگی (polygamy) پر عمل پیرا رہے مگر جب حضرت سلیمان نے وسیع و عریض اور شاندار ہیكل کی تعمیر کی تو حرم بھی وجود میں آ گیا۔ اور سلیمان بادشاہ فرعون کی بیٹی کے علاوہ بہت سی اجنبی عورتوں سے یعنی موآبی، عمونی، ادومی، صیدانی اور حتی عورتوں سے محبت کرنے لگا۔۔۔ سلیمان ان ہی کے عشق کا دم بھرنے لگا اور اس کے پاس سات سوشہزادیاں، اس کی بیویاں اور تین سو حرم میں تھیں۔ ۱۶

اسلام میں بھی حرم کا تصور بادشاہت کے نظریے کے ساتھ پنپا اور "سقوط بغداد (1258) کے بعد جہاں کہیں مسلمان بادشاہتوں کے ڈھی چڑ گئے ان کے ساتھ لونڈیوں کا ادارہ بھی گیا، جب خلافت ملکی حدوں میں بٹی گئی تو یہ بھی ان کے ساتھ تنظیم ہوتی گئیں۔" ۱۷

ہندوستان میں مسلمانوں کی بڑی تعداد سلاطین کے ساتھ آنا شروع ہوئی مختلف مسلم ممالک سے علماء، اکابرین اور ماہرین فنون کثیر تعداد میں ہندوستان ہجرت کرنے لگے جو کہ اس وقت مسلمانوں کے لیے سب سے محفوظ راج دھانی تھی اور یہاں ان کو سلاطین کی پشت پناہی اور مالی امداد بھی حاصل رہی۔ ۱۸ جنوبی ہند میں فیروز کاہم عصر علاؤ الدین حسن بہمن تھا جس کے بارے مشہور مورخ ابوالقاسم فرشتہ نے بہمنی سلطنت کی بنیاد اور فرماں روا علاؤ الدین شاہ کی فتوحات کا سلسلہ رقم کیا اور یہ بھی بتایا کہ بیجا نگر کی فتح کے بعد علاؤ الدین نے عیش و آرام کا وافر سامان مہیا کر لیا اپنی سلطنت کا انتظام درست کرنے کے بعد سلطان لہو لعب میں

زندگی گزارنے لگا۔ بادشاہ نے اپنے محل میں ایک ہزار خوب صورت ترین عورتیں جمع کیں اور دریائے نعمت آباد کے کنارے ایک عظیم الشان باغ لگوا یا۔^{۱۹}

دکن کے قطب شاہی عہد کے شہزادے قلی قطب شاہ کو شاعری، بھاگ متی سے عشق اور حیدر آباد کی وجہ سے شہرت ملی۔ وہ لونڈیوں اور کنیزوں کے علاوہ بارہ بیاریاں بھی اپنے حرم سرا میں رکھتا تھا بقول ڈاکٹر تبسم کاشمیری، اس کی بارہ بیاریاں وہ بارہ دیویاں ہیں جو اس کے بت پرستی کے شیوہ کو شانتی دیتی ہیں۔ بارہ بیاریوں کی صورت میں اس کے مثالی حسن کی تکمیل ہوتی ہے۔^{۲۰} مغلوں کے ہندوستان میں ورود سے اسلامی روایات کا ہندومت سے مکالمہ ہوا۔ حکمرانوں کا اسلام کے بنیادی اصولوں سے کچھ گہرا تعلق نہ تھا۔ یہی وجہ ہے اس دور میں ہندو اسلامی تہذیب کی روایت پروان چڑھی۔ جب ہندوستان میں مغلوں کی حاکمیت سکھ جاتوان کا جسمانی عیش اپنے پیشروؤں سے بہت آگے نکل گیا۔ اُن کے عشرت کدوں اور حرم سرا کی وسعتوں کی دھاک پورے ہندوستان میں بیٹھ گئی، ان کے حرموں میں عجمی اور ہندی حسن جمع ہونے لگا۔ شہنشاہ اکبر اپنے وسیع و عریض حرم میں سیکڑوں ہندو رانیوں کو بیاہ کر لاتا ہے۔ ان ہندو خواتین کی آمد سے جہاں راجپوتوں اور ترکوں میں قومی اتحاد کی بنیاد پڑتی ہے وہیں تیموری قلعوں میں مساجد کے پہلو بہ پہلو مندر بھی نظر آنے لگتے ہیں۔ حرم سرا میں ہندو رانیوں کی بدولت سولہ سنگھار کا چلن شروع ہوتا ہے اور یہیں سے ہندو ایرانی یا کنگا جمی تہذیب کا نیا باب کھلتا ہے۔ مغل فتوحات کے نتیجے میں بادشاہ و امراء کے یہاں خوشحالی کے ساتھ ساتھ فارغ البالی آئی۔ آسائشوں کے لیے دولت کا بے دریغ استعمال بھی اسی دور میں شروع ہوا۔ جہاں حویلیاں، باغات، مقبرے تعمیر ہونا شروع ہوئے وہیں لباس و خوراک میں بھی جدتیں آنے لگیں۔ بے تحاشا دولت نے امراء کے حرم کو بھی وسعت بخشی۔^{۲۱}

مغل امراء کثیر تعداد میں عورتیں اپنے حرم میں رکھتے تھے اس لیے کثیر العیال بھی ہوتے تھے۔ پہلی بیوی کا حرم میں اعلیٰ مقام ہوتا تھا۔ سب بیویاں / بیگمات اور لونڈیاں محل میں ساتھ رہتی تھیں۔ لونڈیوں کی دو اقسام تھیں: اول قسم خوبصورت، تربیت یافتہ، مغنیہ یا قاصدہ جو امراء کے لیے مخصوص ہوتیں۔ انھیں پرستار یا خواص کہا جاتا تھا اور دوسری قسم بڑی عمر یا واجبی شکل و صورت کی ہوتی جو بیگمات اور پرستاروں کی خدمت گزار پر مامور ہوتیں۔ ان کی تعداد بعض اوقات ایک ہزار سے بھی تجاوز کر جاتی۔^{۲۲} مغل حکمرانوں نے اسی پر بس نہیں کی انہوں نے کثیر تعداد میں طوائفوں کی سرپرستی کرنا بھی شروع کر دی۔ اسی باعث قلعوں کے اندر حرم اور گردونواح میں قحبہ خانے بسائے گئے، یوں فتح پور سیکری کا شیطان پورہ، دہلی کا چاوڑی بازار، لکھنؤ اور لاہور کے بازار حسن وجود میں آئے۔^{۲۳}

فرصت پیسہ اور ذوق اودھ کے حکمرانوں کے ہاں بھی وافر موجود تھا۔ اودھ کے حکمرانوں نے حرم کی آرائش کے لیے نہ صرف آزاد خواتین کو کٹینوں کے ذریعے مول خرید کر تعیش کا بھرپور سامان کیا، اس پر مستزاد انھوں نے اپنے حرم سراؤں کو طوائفوں اور بازاری خواتین سے بھی بھر لیا۔^{۲۴} نواب واجد علی شاہ جب ولی عہد سلطنت تھے تو انہوں نے بھی اپنی شہوت پرستی کی ہوس کو جی بھر کے نکالا۔ وہ کہاریوں، رنڈیوں خواصوں، محل میں آنے جانے والی صدہا عورتوں پر عاشق ہوئے۔ جب ان کی طبیعت ہندوؤں کے رہس کی جانب متوجہ ہوئی تو کئی لاکھ روپے اس کے اسباب اور سامان کی درستی میں خرچ کر دیئے۔^{۲۵} ٹیما برج کلکتہ میں قیام کے دوران بھی واجد علی شاہ کو خوب صورت عورتوں کو جمع کرنے کا ویسا ہی شوق تھا جیسا لکھنؤ میں، لیکن یہاں اس شوق نے مذہبی رنگ اختیار کر لیا۔ یہاں پریوں کی بجائے مستوعہ خواتین کی تعداد میں اضافہ ہوا۔^{۲۶}

حکمران کے ساتھ ساتھ امراء و جاگیردار طبقے نے بھی اپنے حرم میں خواصوں کو رکھنا شروع کیا، ڈیرہ دار طوائف تہذیب کی علامت قرار پائی اس کے ساتھ ساتھ آزاد خواتین سے تعلق پیدا کیا گیا۔ ایسی خواتین جو ساز و مطرب، سنگیت، شاعری رقص یا زبان دانی میں مہارت رکھتی امراء اس کی بھی سرپرستی کرتے اور اسے داخل حرم کر لیتے۔ امراء کے حرم میں دو قسم کی بیویاں ہوتی تھیں۔ پہلی وہ آزاد خواتین جن کا نکاح باضابطہ قوانین اور بھاری مہر کے عوض ہم کفو میں ہوتا، دوسری وہ جو بغیر رشتہ ازدواج محض رضامندی کے اصول پر گھروں میں ڈال لی جاتی ہیں۔ ان دونوں میں یہ فرق ہے کہ اولی الذکر کا نکاح مقررہ طریقہ پر ہوتا ہے لیکن مؤخر الذکر کے لئے کوئی خاص طریقہ مقرر نہیں ہے۔^{۲۷}

اردو ناول میں گھریلو خواتین کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ بیگمات کی خدمت گزاری کے لیے لونڈیوں خواصوں اور پیش خدمتوں کا بیان ضمنی طور پر آتا ہے جب کہ حویلیوں کے مرادانے میں طوائفوں، رنڈیوں اور رقصاؤں کا ذکر بھی بیان کا حصہ بنتا ہے۔ بیگمات کی آپسی رنجشوں اور لڑائیوں کا تذکرہ بھی ہے۔^{۲۸} لیکن آزاد خواتین بطور داشتہ یا مدخولہ کا ذکر خال خال ملتا ہے۔ کہیں کہیں گھر والی اور باہر والی عموماً طوائف سے نکاح کے بعد جذبہ حسد و رقابت کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ سب سے پہلے ڈپٹی نذیر احمد نے ناول محسنات (فسانہ مبتلا) میں اس کی تخصیص کی۔ ناول محسنات کا عنوان ہی اس کے موضوع کی وضاحت کرتا ہے۔ یہ ناول پاک باز بی بی کے بالمقابل کچنی یا گھر میں ڈالی ہوئی عورت کے سماجی بندھن کو موضوع بناتا ہے۔

غیرت بیگم صاحب اولاد، مبتلا کی پھوپھی زاد اور دس برس سے بیابھی ہوئی ہے، جسے اپنے جاگیردار حسب و نسب اور شرافت کا غرور ہے۔ اس کی بے ترتیبی، پھوہڑپنے اور بد مزاجی کے باعث شوہر، قلبی و جسمانی تعلق سے بیزار ہے، حویلی کے مردانے میں بازاری عورتوں کی آمد و رفت سے غیرت بیگم بے خبر نہیں۔ ان عورتوں کے معاملے میں مبتلا کو کھلی چھوٹ ہے

کیونکہ وہ جانتی ہے ان خواتین کی حیثیت خس و خاشاک کے سوا کچھ بھی نہیں، جو مبتلا کی شوخ طبیعت کے بہاؤ پر چند روز بہیں گی، پھر دل سے اتر جائیں گی لہذا ان خواتین کے ہونے نہ ہونے سے غیرت بیگم مرتبے پر رتی برابر فرق نہیں پڑتا۔ مگر ادھر مبتلا ہریالی نامی کچنی کو نکاح کر کے گھرا لیا ادھر غیرت بیگم کو معلوم ہوا کہ نئی خوب و ملازمہ حقیقت میں سوکن ہے تو آپے سے باہر ہو گئی اور مار مار کر ہریالی کو آدھ موا کر دیا کیونکہ منکوحہ بیوی کے آنے کا مطلب حکومت میں شراکت داری ہے۔ تب غیرت بیگم کے بھائی نے سمجھاتے ہوئے کہا:

’میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سوکن کے آنے پر تم اس قدر آپے سے باہر کیوں ہو کیا سوکن تم پر آج آئی ہے۔ تمہارا تو بیاہ ہوا ہے پیچھے اور سوکنیں تمہارے بیاہ سے بہت پہلے کی آئی ہوئی موجود تھیں، تم ہی بتاؤ کہ مبتلا بھائی کس دن بے سوکن کے رہے ہیں۔۔۔ تم کیسی مسلمان ہو ایک شخص جب تک خلاف شرع چلتا رہا تم نے ہوں نہیں کی اس کا طریقہ شریعت پر آنا تھا کہ تمہارے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ ۲۹۰

مبتلا نظر باز، عاشق مزاج، حسن پرست اور رنگین طبع شخص ہے جو لکھنؤ سے وارد شدہ ایک بیگم جسے شاعری، ستار، شطرنج، زبان دانی اور مجلس کا سلیقہ آتا ہے پر فریفتہ ہے۔ مبتلانے اس سے ملتے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ ان کی زبان کہے دیتی تھی کہ خواصی یا مصاحبت یا کسی دوسرے طور پر اس نے بادشاہی محلات میں ضرور تربیت پائی ہے۔ (ص ۱۶۳) جب کہ ہریالی، مبتلا کو اس بات پر قائل کر لیتی ہے کہ وہ کوئی کسبی یا کچنی نہیں بلکہ غیرت مند فن کار گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا پیشہ ہی اس قسم کا ہے کہ لوگ بلاوجہ بدگمانی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور اسے رنڈی سمجھ بیٹھتے ہیں۔

ہریالی، مبتلا کو بتاتی ہے وہ لکھنؤ سے یہ ٹھان کر نکلی تھی کہ اگر کوئی بھلا آدمی اسے دست گیری کی پیشکش کرے گا تو وہ اس کے ساتھ دنیا کے سرد و گرم سہنے کو تیار ہو جائے گی مگر اپنے منہ سے کسی کو اپنی مدد کے لیے ہر گز نہیں کہے گی۔ وہ آزاد عورت ہے اس لیے اپنی مرضی سے اپنے قدر دان کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا اختیار رکھتی ہے تاکہ عزت کی روٹی کھا سکے۔

بیگم کا ارادہ تھا کہ "مبتلا آشنائی کے طور پر اس کو گھر میں ڈال لے" (ص ۱۸۳) وہ چاہتی ہے کہ پہلے اسے کچھ عرصے کے لیے آزما یا جائے اگر طبیعت بھلی لگے تو نکاح کی بابت سوچا جاسکتا ہے کیونکہ نکاح عمر بھر کا معاہدہ ہے جس کے لیے من بھاتی بیوی ہونی چاہیے۔ جب کہ مبتلا پر اپنے چچا اور عارف کی پند و نصائح کا اثر ہو چکا تھا اس لیے چاہتا تھا کہ نکاح کر کے گھر لے جائے۔ وقت نکاح مہر پر اختلاف ہوا تو ہریالی نے غیرت بیگم کے مہر کے برابر حق مہر کی شرط رکھی کیوں کہ اس کے خیال میں سب منکوحہ بیویاں

برابر ہوتی ہیں اور سب کو مہر بھی ایک جیسا برابری کی سطح پر دیا جاتا ہے جب کہ مبتلا مہر شرع محمدی چاہتا تھا۔ کیوں کہ غیرت بیگم کے برابر مہر کا مطلب جائیداد کے ایک بڑے حصے سے دستبردار ہونا ہے۔ بالآخر مولوی صاحب مہر مثل کی تجویز پیش کرتے ہیں جس پر ہریالی ناچار خاموشی اختیار کرتی ہے کیوں کہ "سارے خاندان میں کبھی کسی کا نکاح ہوا ہو تو مہر مثل ہو۔ دادی اور پھوپھیاں ساری عمر خرچیاں کماتی رہیں مہر مثل آئے تو کہاں سے آئے۔" ۲۰

خدیجہ مستور کے آنگن میں گھر والی اور باہر والی کی تفریق پر سرسری تبصرہ ملتا ہے جس سے جاگیر دارانہ عہد کے چلن کا پتہ ملتا ہے۔ عالیہ کو اس کی جاگیر دار سخت گیر دادی کے بارے بتایا جاتا ہے کہ وہ اپنے شوہر سے بھی سیدھے منہ بات نہیں کرتی تھی کیوں کہ شوہر کا تعلق باہر والیوں سے تھا۔

"ان کی دودا اشنائیں تھیں جن کے تین لڑکے تھے۔ دادا نے اپنی دشناؤں کے لئے الگ الگ گھر بنوار کھے تھے۔ انہیں تمہاری دادی کی حویلی میں آنے کی اجازت نہ تھی۔ ہاں ان کے بچے حویلی میں آتے جنہیں تمہاری دادی ناموں کے ساتھ حرامی کہہ کر پکارتی تھیں۔ ویسے ان دنوں دشنائیں رکھنا اتنی بری بات نہ سمجھی جاتی اس لئے تمہاری دادی یہ سب کچھ برداشت کر لیتیں۔ جائز بیوی کی شان تو اسی طرح دو بالا رہتی۔ زمینداری کا سارا کام تمہاری دادی کے سپرد تھا۔ دونوں دشناؤں کے کھانے پینے کا سامان اپنے سامنے تلوا کر بھیجا دیا کرتیں۔" ۲۱

ہندوستان میں یورپیوں کی آمد کے بعد نئے سرمایہ دار طبقے کا ظہور ہوا اور ہنگالیوں کے ہندوستان میں قدم جمانے بعد یوریشن نسل اور مسیحیت دونوں ہی بیک وقت پھلنا پھولنا شروع ہوئیں۔ اس کے بعد فرینچ اور ولندیزیوں نے آکر اس کی مقبولیت میں اضافہ کر دیا۔ آگ کا دریا میں قراۃ العین حیدر نے سرل ایشلے کو یورپی سرمایہ دار کے نمائندے کی حیثیت سے پیش کیا ہے جس کے بارے میں اسلوب احمد انصاری صاحب کا بیان ہے۔

"اس کی اقدار زندگی معاشی آسودگی کی دستیابی، تعیش، جنسی فتوحات اور اقتدار کی ہوس ہیں کپنی کے عہدہ داران Decadent نوابوں کی دیکھا دیکھی مست مے ناب رہنے کے علاوہ ایک سے زیادہ نیٹو عورتوں کو بھی اپنے تصرف میں رکھتے اور خدمت گزاروں کی فوج در فوج بھی ان کے دائیں بائیں رہتی تھی" ۲۲

اسی ناول میں شنیلانامی کردار ڈھا کے کے قریبی گاؤں کی رہائشی سات بہنوں میں سے ایک ہے جس کی ایک جھلک نے ہی سرل ایشلے کا دل موہ لیا۔

"اس سے اگلے دن شنیلہ اسرل صاحب کی کوٹھی میں پہنچادی گئی اور اس طرح اس کے خاندان کو افلاس سے نجات ملی۔۔۔ اسرل صاحب نے شنیلہ سے بیاہ نہیں کیا۔ مگر شنیلہ ناخوش نہیں تھی وہ شان سے کوٹھی میں رہتی تھی اور نوکروں پر حکومت کرتی تھی۔ اس کی مانند اور بہت سی دیسی عورتیں اعلیٰ طبقے کے دیگر انگریزوں کے زنان خانوں میں میں براجتی تھیں ان کے بچے پڑھنے کے لیے ولایت بھیجے جاتے تھے اور جب تک ان بچوں کے باپ زندہ رہتے تھے کم از کم اس وقت تک ان کا خاندان آرام سے گزارا کرتا تھا۔" ۳۳

قرۃ العین صاحبہ بتاتی ہیں کہ کمپنی کی بنگال میں روز افزوں ترقی سے کمپنی کے عہداران کے مزاج اور رہن سہن میں بھی فرق آنے لگا جنگ پلاسی کے بعد نوابوں کی طرح زندگی گزارنا ان کا مقصد بن گیا تھا۔ حرم، حقہ، محفلِ سخن، راگ و رنگ ہر انداز میں وہ ہندوستانی شرفاء کی پیروی کرنے لگے۔ یہاں کے اعلیٰ افسران اور نوابوں میں سمجھوتہ ہو گیا اور دونوں مہذب انداز میں گھل مل گئے۔ اب کمپنی کا مقصد دولت جمع کر کے انگلستان واپس لوٹنا نہیں تھا بلکہ اب ہر افسر بشمول اسرل ایشلے ایک ہی خواب دیکھتا کہ کسی طور نواب بن جائے اسی باعث وہ اردو ادب میں دل چھبسی لیتا تھا اور حرم میں دس دس دیسی عورتیں رکھتا تھا اسرل بھی شنیلہ کو اپنی کوٹھی میں داخل کر کے گویا باقاعدہ نواب بن گیا۔

کسی ہندوستانی خاتون کے انگریزوں کی مصاحب بننے یا داخل حرم ہونے کا احوال زیادہ صراحت کے ساتھ شمس الرحمن فاروقی کے ناول کئی چاند تھے سر آسماں میں بیان کیا گیا ہے۔ ناول وزیر خانم، والدہ داغ دہلوی کی زندگی کے تقدیری وجودی جبر کی داستان ہے۔ یہ ناول تہتر ابواب پر مشتمل ہے۔ مصنف نے عہدِ مغلیہ کی خفیف ہوتی سیاسی طاقت اور کمپنی کی ابھرتی ہوئی عمل داری کو ہندو اسلامی تہذیب کے پس منظر میں بیان کیا ہے۔ اس ناول میں تاریخ کے شانہ بشانہ ہندو اسلامی تہذیب کی مرقع نگاری بھی کی گئی ہے۔ بیان کنندہ تین مختلف زاویوں سے وزیر بیگم کی شخصیت کو سامنے لاتا ہے: اول ڈاکٹر خلیل اصغر فاروقی ماہر امراض چشم کی ڈائری/ یادداشتیں ہیں جو وزیر بیگم کے مختصر حالات زندگی اور ان کے ورثاء کا مکمل تعارف فراہم کرتی ہیں۔ دوم: محمد یوسف سادہ کار بطور کردار راوی، جو وزیر خانم کے والد ہیں اور اپنے اہل و عیال اور آبا و اجداد کا مفصل احوال رقم کرتے ہیں سوم: غائب راوی، اکیسویں باب سے کہانی کی ڈور غائب راوی کے ہاتھ آتی ہے اور مار سٹن بلیک کی بی بی وزیر خانم کی کشمکش کا بیان شروع ہوتا ہے۔

ناول کے آغاز میں وزیر بیگم کی تصویر برٹش میوزیم سے ملنے اور خلیل اصغر فاروقی تک پہنچنے میں وہی مناسبت موجود ہے جو وزیر خانم کے جد امجد اور خاندان کی بنی ٹھنی کی تصویر کے باعث کشن گرٹھ سے کشمیر پہنچنے اور واپس راجھستان کی مٹی میں مل جانے میں ہے۔ ان واقعات میں دونوں تصاویر کا اپنی اصل کی جانب مراجعت کا سفر دکھایا گیا ہے۔

ناول کے پہلے دو حصوں میں بنی ٹھنی اور وزیر بیگم کے ملکوئی حسن، تمکنت و وقار کو سبھاؤ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے بنی ٹھنی کی تصویر جس کا ناول میں ذکر ہے اس کے باعث اسے راجھستان کی مونا لیزا بھی کہا جاتا ہے جو راجپوت حکمران راجا ساونت سنگھ کے حرم میں داخل بہترین مغنیہ تھی اس کے حسن کی نمکینی اور راجا سے بے پناہ محبت کے باعث اسے کشن کی رادھا بھی کہا جاتا تھا۔^{۳۳} ناول میں یہی بے لوث جذبہ وزیر خانم اور نواب شمس الدین احمد کے درمیان بپنپتے دکھایا گیا ہے۔ وزیر خانم اور بنی ٹھنی کی مماثلتوں کے دوران میں سیاہ رنگ، مزاج میں تمکنت، فن کارانہ صلاحیت، بے خودی و وارفتگی کی کیفیات اور مقبولیت کے تلازمات بیان کر کے وزیر خانم کے شخصی تاثر کو خاندانی پس منظر میں ابھارا گیا ہے۔ وزیر خانم کے جد امجد میاں مخصوص اللہ کا چترکاری میں ماہر ہونا اور بنی ٹھنی کی خیالی تصویر بنانا، پھر کشمیر پہنچ کر قالین بانی کی تعلیم حاصل کرنا اور ملکی سرحدوں کے پار مشہور ہونا، پھر سب کچھ چھوڑ کر بنی ٹھنی کے خیالوں میں غرقاب ہونا، وزیر کے پردادا یحییٰ بڈگامی کا قالین بانی میں مشہور ہونا اور ہندوستان کے سفر میں بنی ٹھنی کی تصویر دیکھ کر وارفتگی کی کیفیات سے دوچار ہونا اور علاقہ دنیاسے ترک تعلق کر لینا، وزیر کے دادا یعقوب بڈگامی اور ان کے بھائی داؤد بڈگامی کا خاندانی پیشہ چھوڑ کر صداکار بننا اور شہرت یافتہ ہونا پھر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یک دم کشن گرٹھ کی جانب مراجعت کرنا۔ ان سب واقعات میں فنون لطیفہ کی جانب فطری میلان، فن کارانہ مہارت، نئی طرز کی ایجاد، شہرت و ناموری، خود رفتگی اور کچھ کر گزرنے والی طبیعت کو دکھایا ہے۔ اسی خاندانی پس منظر کے باعث یہ سمجھنا زیادہ مشکل نہیں رہتا کہ انیسویں صدی کے پدر سری سماج میں وزیر خانم بطور شاعرہ اپنی منفرد پہچان بنانے میں کیوں کر کامیاب ہوتی ہے بہ قول محمد یوسف سادہ کار: 'شعر گوئی اس کے لیے مردوں کی برابری کرنے کا مشغلہ اور دلبری و دبستان کا ایک ڈھنگ تھی اور اس حد تک وہ فن شعر میں طاق تھی۔'^{۳۵} جس زمانے میں وزیر خانم کے نمکین حسن اور کلام کی دھوم علاقے بھر میں مچی ہوئی تھی، دلی کے بیشتر شرفا سے پابند کرنے، مصاحب بنانے یا نکاح میں لانے کے خواہشمند تھے، عین اس زمانے میں وہ یک دم سب کچھ چھوڑ چھاڑ مار سٹن بلیک کے ساتھ چل پڑتی ہے۔

وزیر خانم کے اس فیصلے سے محمد یوسف سادہ کار اور بڑی بیگم کو صدمہ پہنچتا ہے۔ اس صدمے اور ناراضی کی بڑی وجہ انگریز کے حرم میں داخل ہونا تھا۔ اس سے پہلے وزیر کی منجھلی بہن عمدہ خانم بھی نواب یوسف علی خاں ولی عہد راجپور کے حرم میں

داخل ہو چکی تھی مگر نوابین کے حرم میں آزاد خواتین کا پہنچنا یا ان کی سرپرستی میں آجانا شرفاء کے ہاں عمومی رویہ سمجھا جاتا تھا۔ اور اس رویے کو محمد یوسف سادہ کار سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا ہے، جس کی اپنی کفالت چاوڑی بازار میں اکبری بائی کے زیر اثر ہوئی۔ اکبری بائی کے کوٹھے پر تماش بین و شائقین کا جم غفیر ہونا خود محمد یوسف سادہ کار کو ساز و سنگیت کی تعلیم دلوانا اور ان کی شادی بائی جی کی اکلوتی بیٹی سے ہونا، اسی رسم کا تسلسل ہے جس پر صدیوں سے عمل ہوتا آیا ہے کہ فن کار کا کسی نواب یا امیر کی سرپرستی میں چلے جانا کوئی معیوب بات نہیں۔ سماج میں اس رسم کو قبول عام (accepted Norms) حاصل تھا۔ سو عمدہ خانم ایسی متین طبیعت، بذلہ سنج، شعر خوانی اور سنگیت میں ماہر اور بیگماتی رکھ رکھاؤ کی حامل اگر نواب صاحب کے متوسلین میں شامل ہوئی تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہوئی۔ شرفا میں سے چند ایک نے ان کے گھرانے سے کنارہ ضرور کیا مگر پھر بھی سماج میں ان حیثیت بنی رہی کیونکہ نواب صاحب کی وساطت سے ان کا اٹھنا بیٹھنا نوابی خاندان میں ہو گیا۔ مگر وزیر خانم کا مروجہ طریقہ کے خلاف چلنا خاندان اور علاقے بھر سے لاطعلق کے اظہار پر مبنی تھا۔

وزیر خانم کے باغی خیالات سب سے پہلے بڑی بیگم سے گھر بسانے کی بابت تکرار کی صورت سامنے آتے ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ مجھ میں کوئی عیب نہیں جس کو شادی سدھار دے گی اس لیے وہ شادی نہیں کرے گی۔ اس کے خیالات کا خلاصہ یہ ہے کہ عموماً شادی کا مقصد محض یہی ہوتا ہے کہ بچے پیدا کریں، شوہر اور ساس کی جو تیاں کھائیں چولہے چوکھے میں پڑ کر اپنا حسن اور جوانی برباد کریں۔ جب خدا نے اسے مکمل بنایا اور سمجھ بوجھ دی ہے تو وہ اپنی اہلیت سے کام لے گی اور اپنی مرضی کی زندگی جیے گی۔ چپ چاپتے مردوں کی ہوس کی بھیٹ چڑھنا اسے کسی صورت گوارا نہیں کیونکہ شادی کی صورت شوہر کو اختیار ہوگا کہ جب چاہا جوتے مار کر کال کوٹھری میں بند کرے اور خود عیاشی میں زندگی بسر کرے۔

"شادی کر کے میں خواہی خود کو زندگانی بھر کے لیے کیوں پھنساؤں تعلق وہی اچھا جس کو توڑ سکوں، میں یہ ضرور پوچھوں گی کہ عورت پیدا ہو کر میں نے کون سا کفر کیا تھا کہ اس کی سزا میں جیتے جی دوزخ میں ڈال دی جاؤں۔۔۔ میں شادی نہ کروں گی... شاہزادہ تقریر میں لکھا ہو گا تو آئے گا۔ نہیں تو، نہ سہی۔ مجھے جو مرد چاہے گا اسے چھکوں گی پسند آئے گا تو رکھوں گی، نہیں تو نکال باہر کروں گی۔"^{۳۶}

وزیر کا یہ بیان عام ہندستانی عورت کا نہیں ہے۔ عوام الناس میں ایک زوجیت کا رواج تھا۔ یہاں شادی کے بعد عورت کی وہی گت بنتی ہے جو محولہ بالا پیرا گراف میں بیان کی گئی ہے۔ ایسا بیان اسی خاتون کا ہو سکتا ہے جس کے پاس نہ صرف ہنر یا مشاتی ہے

بلکہ social mobility کے تصور کو بھی خوب سمجھتی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اگر اس کے فن کا کوئی قدر دان نہ ملا تو اس کے لیے واپسی کے دروازے کھلے ہیں۔ اور وہ کسی اور کی سرپرستی میں جاسکتی ہے، داخل حرم ہونے کی صورت میں نوابین اپنی خواص یا متوسل کے عیش و آرام کا ہر طرح سے خیال رکھتے ہیں اور اولاد کی صورت میں بچے کو باپ کے نام کے ساتھ پداری ترکہ بھی مل جاتا ہے۔ سوشادی کر کے تاحیات کسی ایک مرد کی قید میں رہنا وزیر خانم کو ہرگز گوارا نہیں۔

وزیر خانم کا اس زمانے میں مارسٹن بلیک سے متوسل ہونا عمومی بات نہ تھی۔ یہ رسم خاص اہل خاص اعلیٰ طبقات تک محدود تھی۔ اودھ کے کرنیل ولیم گارڈنزا اور دکن کے جرنیل پامر نے بالترتیب نواب کھمبائیت اور شاہ عالم ثانی کی منہ بولی بیٹی سے شادی کی تھی۔ وہ بھی اس صورت کہ دونوں حضرات ولایت ترک کر کے مستقلاً ہندوستان آباد ہوئے اور یہ شادیاں بھی سیاسی مصلحتوں کے تحت ہوئیں۔ جب کہ مارسٹن بلیک کی مانند عام انگریز افسروں کی یہ کیفیت تھی کہ ”ہر انگریز ایک نہیں دو چار چھ ہندوستانی بیبیاں رکھتا تھا، طوائفوں اور ارباب نشاط سے عارضی تعلق یا کبھی کبھی کا آنا جانا اس پر مستزاد تھا۔“ (ص 165)

وزیر خانم اس امید پر مارسٹن بلیک کے ساتھ چلی آتی ہے کہ اسے میم صاحبان کی ہم نشین و ہم جلیسی میسر ہوگی۔ ہندو مسلم شرفاء کی خواتین سے میل ملاپ ہوگا، اور محلات یاد رباروں تک اس کی رسائی ہو پائے گی مگر بے پور کی حویلی پہنچتے ہی اسے ثقافتی دھچکا (cultural shock) لگتا ہے۔ حویلی میں سوائے ملازمین کی فوج کے کسی کو آنے جانے کی اجازت نہیں؛ عید تہوار پر اکلا پاپے اور اگر تنہائی کا شکار کوئی ملاقاتی انگریز افسر آیا بھی تو دیوان خانے تک محدود رہا۔ وزیر خانم کے پاس ملازمین کی کثیر تعداد ہے جس پر اس کی حکمرانی مسلمہ ہے ان کے سوا کسی سے ملنے کی اجازت نہیں۔ یہ ملازمین ایک روزن کی مانند اس کی گھٹن کی صرف نکاسی ہی کر سکتے ہیں۔

وزیر خانم کی شخصیت میں ایک اہم تضاد نظر آتا ہے۔ انگریز سے بنا نکاح رہنا اور اس سے ولد الزنا پیدا کرنے پر وزیر خانم کو کوفت ہے نہ احساس گناہ لیکن انگریز کے گھر میں آتے ہی شراب، سور کے گوشت پر پابندی لگا دینا، برتنوں کو الگ کرنا اور ان پر آب زمزم کا چھڑکاؤ کر کے پاک کرنا علاوہ ازیں طہارت کے لیے آب دار خانے کا نظام قائم کروانا، روزنہادھو کر پاک صاف ہونا اس کی شخصیت کے دوہرے پن کو دکھاتا ہے۔ استعمال کی جانے والی اشیاء میں کراہت کا عنصر نمایاں ہے جب کہ تعلق زنا شوئی میں یہ کراہت ناپید ہے۔

وہ یہ بھی جانتی ہے کہ انگریزوں کی منکوہہ بیبیاں یا منگیتریں ولایت میں رہتی ہیں لیکن ہندوستان میں آکر وہ وقتی طور پر بی بی کر لیتے ہیں اور جب جی چاہے انہیں چھوڑ کر ولایت پلٹ جاتے ہیں۔ ان کے واپسی کے سفر میں نہ تو ہندی بی بی مزاحم ہو سکتی ہے نہ

اس کی اولاد۔ اسے یہ بات بھی کھلتی ہے کہ مارسٹن اور اس کی ہم قوم، اہل ہند کو غیر مہذب سمجھتے ہیں۔ وہ گھریلو ملازمین کو چور کہتے ہیں، ان کی ہتک کرتے ہیں۔ جب کہ ملازمین سمیت وزیر خانم خود انگریزوں کو لٹیرے، سازشی اور خود غرض سمجھتی ہے۔

جے پور آنے پر وزیر خانم اپنی قیدیوں کی سی حالت پر غور کرتی ہے تو اسے تین الگ الگ دنیاں نظر آتی ہیں: اول ہندوستانی شرفاء کی جو آہستہ آہستہ انگریزوں کے زیر نگیں ہوتے جا رہے ہیں؛ دوم فرنگی دنیا جس میں نوکروں کے سوا ہندوستانیوں کا گزر ہی نہیں؛ سوم انگریزوں کی داخل حرم خواتین کی دنیا۔ جو یا تو شنیلہ کی مانند مجبوراً بھیجی گئی ہیں یا وزیر خانم کی طرح خواہشوں کے سراب کے پیچھے بھاگتے بھاگتے از خود آگئیں اور انگریزوں کی متوسلین بنیں۔

’اسے معلوم ہوا کہ بیبیاں سب بیبیاں ہیں، ہندو یا مسلمان، کم ذات یا اعلیٰ ذات تعلیم یافتہ یا اہل حرفہ ایسی کوئی قید نہیں نہ تعداد کی کوئی شرط ہے پھر یہ کہ سب کا مرتبہ آپس میں برابر ہے اس فرق کے ساتھ کہ جس کی بی بی کا صاحب جتنا بڑا آدمی ہو گا اتنی ہی بلند حیثیت اس بی بی کی بھی ہوگی۔۔۔ وہ اپنے صاحب کے حرم میں اکیلی تھی اور آپس کی بات چیت میں مارسٹن بلیک اسے اپنی منکوحہ بیوی کہتا تھا ورنہ عام طور پر نکاح یا شادی کی کوئی اسلامی یا عیسائی رسم کسی بی بی کے ساتھ ادا نہ ہوتی تھی۔‘^{۳۷}

ناول کے ذریعے معلوم ہوتا ہے کہ انگریز حکام بالا کو خبر کرنے کا اہتمام کرتے تھے کہ فلاں بی بی کو داخل حرم کیا گیا ہے، زیادہ سے زیادہ خاتون کا نام بھی بتا دیا جاتا۔ جب کہ افسران بالا تو اس جھنجھٹ سے بھی آزاد تھے، بعض انگریز اپنی متوسلین کو بالکل پردہ اخفا میں رکھتے، جب جی چاہتا دوسری عورت کو گھر میں ڈال لیتے؛ جیسے جیسے ان کی ترقی ہوتی ویسے ویسے عورت بھی خوب سے خوب تر ڈھونڈ نکالتے؛ بعض انگریز اس بات کا خیال رکھتے کہ ولایت پلٹنے یا انتقال کی صورت میں بی بی اور اس سے پیدا شدہ اولاد کے لیے کچھ جائیداد وقف کرتے؛ بعض تو سب کچھ سمیٹ کر ولایت پلٹ جاتے اور بی بی کو خبر ہی نہ ہونے دیتے۔ اگر کوئی اعلانیہ اقرار بھی کرتا کہ فلاں بی بی منکوحہ ہے تو بھی ایسے اعلان نامے کی حیثیت صفر ہوتی کیوں کہ انگریزی قانون میں وہی شادی منظور شدہ قرار دی جاتی جو عیسائی رسوم و رواج اور کمپنی کے قواعد و ضوابط کے تحت تحریری شکل میں کی جاتی۔ لہذا ان مشکلات کے علاوہ متوسل اور نام نہاد نکاحی بیویاں اولاد کے معاملے میں بھی خالی ہاتھ رہتیں کیوں کہ اولاد کی نسبت والد بطور بچوں کے کفیل، عیسائی نام رکھنے، بتسمہ کرانے، مسیحیت کے اصولوں کے مطابق پرورش و پرداخت کرنے کا پابند تھا۔ قانونی کاغذات میں بچے عیسائی ناموں سے بلا اندراج پاتے اور اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان روانہ کیے جاتے۔ ماں کا حق صرف اتنا تھا کہ وہ حرم سرا میں بچوں کو ہندوستانی نام سے بلا

سکتی تھی۔ ان تمام حقائق کا علم ہونے کے بعد وزیر خانم جان جاتی ہے کہ اس کی حیثیت اپنے صاحب کا بستر گرم کرنے کی حد تک ہے۔ مار سٹن بلیک نوکروں کے سامنے لاکھ اسے منکوحہ کہے لیکن وہ اس کی داشتہ ہی ہے۔

یہاں اس کے حسن یا جسم سے لگاؤ تو ہے مگر فن کی بے توقیری بھی ہے۔ اسی کشمکش میں وہ اپنی اور منجھلی بیگم کی کیفیات کا موازنہ کرتی ہے۔ ہندستانی شرفاء میں سے اگر کوئی کسی عورت کو خواص بنا لے یا داخل حرم کرے تو اس کے حکم کو ہی ملکہ زماں سمجھ کر تسلیم کیا جاتا ہے۔ خواہ نواب صاحب کی ہم کفو بیویاں بڑے بڑے مہر بند ہوائے ہی کیوں نہ موجود ہوں۔ مگر فرنگی کی بی بی کے معاملے میں لوگوں میں سخت تعصب موجود ہے۔ ان بیبیوں سے ملنا تو درکنار انہیں کھلے بندوں بازاری یا کبھی کہنے میں بھی کسی کوتاہی نہیں ہوتی۔ منجھلی کا تعلق بھی نواب یوسف علی خاں صاحب سے ویسا ہی ہے جیسا وزیر کا بلیک صاحب سے مگر منجھلی سے بڑی بہن اور والد ملنا جلنا ترک نہیں کرتے، وہ موقع کی مناسبت سے دلی والیوں سے بھی میل جول رکھتی ہے اور ان کے یہاں عید تہوار اور جشن و عرس میل ملاقات کا وسیلہ بنتے ہیں۔ جب کہ وزیر خانم انگریز کے حرم میں گھر بار، مذہب، شہر، رسم و رواج، اور ذات پات کا کھکھیر پالے بغیر الگ تھلگ بیٹھی ہے۔ اگر اسے تسکین ہے تو محض اس بات پر کہ وہ اپنے صاحب کے حرم میں اکیلی ہے اور نوکروں کی ایک فوج پر حاکم ہے جب کہ منجھلی کے نواب صاحب کے ہاتھ نہ تو نوابی آئی نہ ہی مسند۔ اس لیے ان کے ہاں کثیر تعداد میں ملازمین نہیں جیسے وزیر خانم کو میسر ہیں۔ مزید یہ کہ نوابین کی طبیعت کا بھی کوئی اعتبار نہیں کب کس لمحے کس پر دل آ جائے، اسے داخل حرم کر کے پہلی سے منہ موڑ لیا جائے۔ ان بہلاؤں اور طفل تسلیوں کے ساتھ وہ مار سٹن کے ساتھ رہنا سیکھ جاتی ہے تاکہ وقتیکہ مار سٹن کی بے وقت موت، بچوں کی جدائی، ملازمین کی فوج کا چھٹنا اور ترکے سے محروم ہو جانے کے صدمات جھیل کر وہ محض تحفہ تادیے جانے والے اثاثہ البیت سمیٹے دلی واپس آ جاتی ہے۔

یہاں وزیر خانم کو ریزیڈنٹ ولیم فریزر کا دعوت نامہ موصول ہوتا ہے۔ جو امر دپرست اور بی بیوں کا شوقین ہے لیکن وزیر مار سٹن بلیک کے ساتھ رہتے ہوئے آزما چکی ہے کہ بیبیوں کی زندگی بے رنگی، بے کیفی اور تنہائی میں گزرتی ہے مزید یہ کہ بچوں کے عیسائی بننے اور پچھڑ جانے کا صدمہ الگ سہنا پڑتا ہے اس لیے وہ طے کر لیتی ہے کہ اسے کسی بھی انگریز کی مدخولہ بننا قبول نہیں۔

"مجھے کسی موئے مسنڈے، انگریز کے حرم میں پڑے سڑتے رہنا منظور نہیں، بلا سے وہ فارسی بولتا ہو مجھے اپنی زندگی کا نقشہ یوں مرتب کرنا ہے کہ۔۔۔ اس کے رواں ہونے کی راہیں پیدا

ہوں اور عزت بھی بنی رہے، ورنہ کیا میں کوئی مونڈھے والی ہوں کہ بات کی بات میں ٹکسال
چڑھ جاؤں، وہ آنکھ مندری اور ہوں گی جو دو وقت کی روٹی پر آبرو بیچ دیتی ہیں۔^{۳۸}

ولیم فریزر کی محفل میں وزیر خانم کی ملاقات نواب شمس الدین احمد خان سے ہوتی ہے جن کے بارے میں اسے پتہ چلتا
ہے کہ دوہم کفو بیویاں رکھتے ہیں جب کہ ان کی والدہ کم اصل، ذات کی ہندو اور داخل حرم خاتون تھیں۔ اسی لیے نواب صاحب کا
صحیح النسب سوتیلے بھائیوں سے کاروبار سلطنت میں قضیہ ہے۔ ان کی عائلی و سیاسی زندگی تلخ ہے۔ وزیر خانم ریزیڈنٹ سے جان
چھڑانے کی جلدی میں نواب صاحب کے ساتھ ربط بڑھاتی ہے اور بالآخر نواب صاحب اسے پیشکش کرتے ہیں کہ
"چاندنی چوک میں خانم کے بازار میں سہ منزلہ مکان، اوپر کی دو منزلیں آپ کی اقامت کے
لیے اور نچلی منزل کی دکانوں کا کرایہ آپ کی تحویل اور صرف میں۔۔۔ مکان تاحیات آپ کا
اور پھر آپ کے اخلاف کا، آپ کے گھر اور ملازمان کے سارے اخراجات کی کفالت ہمارے
ذمہ ہوگی، پاندان اور داد و ہش کے لیے پان سو روپے ماہانہ آپ کی خدمت میں اوپر سے پیش
کیے جائیں گے ایک سال کی پیشگی کے طور پر ہزار ہزار کے چھ توڑے باہر پالکی میں آپ کی
قبولیت کے منتظر ہیں۔"^{۳۹}

اتنا سب کچھ یک مشت مل جانے پر وزیر خانم نواب صاحب کی مدخولہ بننا قبول کر لیتی ہے۔ اگرچہ اس کے دل میں منکوحوہ
بیوی بننے کی خواہش دہی ہے لیکن وہ اپنے منہ سے بیان کرنے کی قدرت نہیں رکھتی۔ اس لیے کہ نوابین میں منکوحوہ بیوی ہم کفو،
بھاری مہر کے عوض بیاہی جاتی ہے۔ وہ نواب سے عارضی تعلق کی چھاؤں، بے یاری کی طویل مسافت اور دردر بھٹکنے سے بہتر سمجھتی
ہے۔ کیوں کہ یہاں عمر بھر کی سرپرستی کے ساتھ ساتھ یہ امکان بھی موجود ہے کہ اگر وہ نواب صاحب کو اولاد نرینہ دے پائی تو کچھ
بعید نہیں کہ نواب صاحب اسے منکوحوہ کے درجے پر بھی فائز کر دیں۔ جیسے خود والدہ نواب کا مرتبہ ان کی پیدائش کے بعد اوج ثریا
پہ چاہنچا تھا۔ یا پھر وزیر کی سگی بہن عمدہ خانم نواب یوسف علی خان کی ممتوعہ زوجہ بن گئی تھی۔

تاریخی کتب خواتین کے تذکرے سے خالی ہیں جب کہ مذہبی متون میں خواتین کی علیحدہ حیثیت کو مد نظر رکھ
ضابطہ حیات دیا گیا ہے۔ اسی طرح بادشاہوں کے قوانین و ضوابط میں بھی عورتوں سے متعلق اصول و ہدایات موجود ہیں۔ بادشاہی
نظام کی ایک خاصیت حرم کو سجانا ہے۔ حرم دراصل زنان خانہ ہے جہاں والدہ شاہ، اس کی بیویاں، لونڈیاں اور حرم میں داخل شدہ
خواتین رہتی ہیں۔ دنیا کی بڑی تہذیبوں مثلاً ایران، یونان، ہندوستان اور بازنطین میں حرم کو حسین خواتین سے سجانا بادشاہوں کا
محبوب مشغلہ رہا ہے۔ مسلمانوں کے یہاں حرم سجانے کی روایت دور بنو عباس میں شروع ہوئی۔ بعد ازاں سلاطین عثمانیہ کے عہد

میں حرم کی کڑی نگرانی کی جانے لگی۔ یہاں تک کہ سلاطین عثمانیہ میں مہر کے عوض آزاد و ہم کفو عورت سے نکاح کرنے کا رواج ہی ختم ہو گیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں حکمرانوں کے یہاں حرم سجانے کا طریقہ کار ترکوں اور ایرانیوں سے مستعار تھا۔ مغلوں کے دور میں دولت کی فراوانی کے ساتھ حرم کی وسعت میں بھی اضافہ ہوا حرم کی خوش رو خواتین کو موسیقی و رقص کی تعلیم و تربیت دی جانے لگی انہیں پرستار یا خواص کہا جانے لگا۔ اس دور میں محض بادشاہ ہی نہیں امراء و جاگیردار بھی اپنے حرم سجانے لگے۔ اسی دور میں طوائفوں کو ڈیرہ دار بنا کر ان کی سرپرستی کی گئی اور آزاد عورت کی بھی فن لطیف میں مہارت کی بنا پر دست گیری کر کے داخل حرم کرنے کا رواج شروع ہوا۔ اودھ کے نوابین کے ہاں حرم جنس کے نگار خانے اور رہس کی پریوں کی دنیا میں تبدیل ہو گئے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی فتح بنگال کے بعد اس کے اہلکاروں کا ربط جب امراء و نوابین سے ہوا تو وہ بھی ہندوستانیوں کی مانند حرم سجانے کے لیے کمر بستہ ہوئے۔ دیسی خواتین کو بطور حرم اپنی کوٹھیوں میں جبراً یا بمرضی رکھا جانے لگا۔ جہاں وہ اپنی ثقافت سے کٹ کر سنہری پنجرے میں بند ہو گئیں۔ یورپیوں کے یہاں خواتین کی حیثیت ان کے فن یا مشاقتی کی بدولت نہیں تھی نہ ہی انگریز، ان خواتین کے قدر دان تھے۔ ان کی حیثیت صاحب کے لیے محض Joy Toy کی سی تھی۔ جس میں ذات پات، لیاقت و ہنر اور سلیقہ مجلس سب بے معنی تھا۔ البتہ حُسن اور جوانی کو ضرور مد نظر رکھا جاتا تھا۔ یہاں مدخولہ کی حیثیت اس کے صاحب سے جڑ گئی۔ جتنا بلند مرتبہ افسر ہوتا اس کی مناسبت سے مدخولہ کا رعب دیگر افسران کی بیبیوں اور ملازمین پر پڑتا۔ افسر سے ان کا تعلق اسی وقت تک رہتا جب تک وہ ہندوستان میں قیام پذیر رہتے، ولایت جانے کی صورت میں تعلق اختتام کو پہنچتا، اولاد اور ان کی تعلیم و تربیت پر بھی خواتین کا حق تسلیم شدہ نہیں تھا۔ علیحدگی کی صورت نہ تو تر کہ دینے کا رواج تھا نہ ہی جائیداد، یہاں تک کہ اولاد کی شکل دیکھنے سے بھی محروم ہو جاتیں۔

اس کے برعکس ہندوستانی شرفاء کے یہاں آزاد خواتین یا خواص کا مرتبہ ہم کفو بیوی سے کم اور لونڈیوں سے بلند ہوتا تھا۔ آزاد خواتین نہ صرف سرپرستی و قدر دانی کی تلاش میں نوابین کے حرم تک آتیں تھیں بلکہ ان کے پاس یہ امکان بھی موجود ہوتا تھا کہ اگر ان کے فن کا جادو نواب صاحب پر چل جائے تو وہ نہ صرف نواب صاحب کے مزاج میں دخیل ہو جائے گی بلکہ نواب اس سے نکاح کر کے عزت و توقیر سے بھی سرفراز فرمائیں گے۔ ان کی اولاد والد کے نام کے ساتھ پدری تر کے کی بھی حق دار ہوگی اور سماج میں بھی ان کے لیے قبولیت کا نرم رویہ موجود ہوگا۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر مبارک علی، 'گلبدن بیگم بحیثیت مورخ،' مشمولہ تاریخ میں عورت کا مقام، مرتبہ ڈاکٹر مبارک علی (لاہور: تاریخ پبلشرز، ۲۰۱۷ء)۔ ۳۴۔

۲۔ مالک رام نے حمورابی کے تعارف میں لکھا: "حضرت مسیح ناصر علیہ السلام سے تقریباً دو ہزار سال پہلے بابل (عراق) کا ایک بادشاہ حمورابی نام ہوا ہے۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہم عصر تھا۔ عہد نامہ قدیم میں اس کا ذکر آیا ہے اس نے ایک قانون نافذ کیا۔ اور اسے پتھر کے کھمبے پر کندہ کروا کے سبارہ کے مندر کے احاطے میں کھڑا کر دیا۔" مالک رام، 'بابل تہذیب و تمدن (دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 1992ء)، 39-40۔

۳۔ مالک رام، 'بابل تہذیب و تمدن، 39-40۔

۴۔ کتاب پیدائش میں مرقوم ہے: 'اور ابراہیم کی بیوی ساری کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اس کی ایک مصری لونڈی تھی، جس کا نام ہاجرہ تھا اور ساری نے ابراہیم سے کہا کہ دیکھ خداوند نے مجھے تو اولاد سے محروم رکھا ہے سو تو میری لونڈی کے پاس جا شاید کہ اس سے تیرا گھر آباد ہو اور ابراہیم نے ساری کی بات مانی اور ابراہیم کو ملک کنعان میں رہتے دس برس ہو گئے تھے جب اس کی بیوی ساری نے اپنی مصری لونڈی سے دی کہ اس کی بیوی بنے اور وہ ہاجرہ کے پاس گیا اور جب وہ حاملہ ہوئی اور جب اسے معلوم ہو گیا کہ وہ حاملہ ہو گئی ہے تو اپنی بی بی کو حقیر جاننے لگی تب ساری نے ابراہیم سے کہا کہ جو ظلم مجھ پر ہوا وہ تیری گردن پر ہے۔ کتاب پیدائش باب ۱۶، آیت ۶۳۱۔

۵۔ کتاب خروج، باب 19، آیت 29

۶۔ ملاکی میں درج ہے: 'سبب یہ ہے کہ خداوند تیرے اور تیری جوانی کی بیوی کے درمیان گواہ ہے۔ تو نے اس سے بے وفائی کی ہے۔ اگرچہ وہ تیری رفیق اور منکوحہ بیوی ہے۔ اور کیا اس نے ایک ہی کو پیدا نہیں کیا باوجود یہ کہ اس کے پاس اور ارواح بھی موجود تھیں۔ پھر کیوں ایک ہی کو پیدا کیا اس لیے کہ خدا ترس نسل پیدا ہو۔ پس تم اپنے نفس سے خبردار رہو اور کوئی اپنی جوانی کی بیوی سے بے وفائی نہ کرے کیوں کہ خداوند اسرائیل کا خدا فرماتا ہے میں طلاق سے بیزار ہوں اور اس سے بھی جو اپنی بیوی پر ظلم کرتا ہے۔ کتاب ملاکی، آیت ۱۶۳۱۔

۷۔ آچار یہ چانکیہ، ارتھ شاستر، مترجمہ شان الحق حقی (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو، ۲۰۱۰ء)، ۲۲۔

۸۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، خلافت و ملوکیت (نئی دہلی: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ۱۹۷۴ء)، ۱۸۔

۹۔ ڈاکٹر مبارک علی، مغل دربار (لاہور: نگارشات، ۱۹۸۴ء)، ۲۰۔

۱۰۔ شورش کاشمیری، اس بازار میں (لاہور: مکتبہ چٹان، سن)، ۵۴۔

11. ‘ Young, talented slave girls were selected and given an appropriate education to enable them to pursue this art. Thus, they belonged to the same branch of feminine slavery as the slave singers, the qiyān, who were also slave courtesans, and, occasionally, concubines, typically for the elite and growing urban classes. The institution of the slave courtesan opened up possibilities of social mobility for women. If they performed well and their fame spread, they gained access to high society and its wealth.’

Pernilla Myrne, 'A Jariya's Prospects in Abbasid Baghdad', in Matthew S. Gordon, and Kathryn A. Hain (eds), *Concubines and Courtesans: Women and Slavery in Islamic History* (New York, Oxford University Press, 2017), 52

۱۲۔ مولانا محمد انشا اللہ نے لکھا ہے: ’حرم سرا کی خواتین جو خواہ زر خرید ہوں یا بھر ضعی خود آئیں زیادہ تر ان اضلاع کی ہوتی ہیں جو قلمرو عثمانیہ سے باہر ہیں اور خاص کر سرکیشیا سے زیادہ آئیں۔ ان خواتین میں سے سلاطین عموماً سات کو منتخب کرتے ہیں جو قاون یعنی بیگمات حرم کہلاتی ہیں اور باقی ادالیک پکاری جاتی ہیں جو قاونوں کی خادمہ متصور ہوتی ہیں۔ حرم سرا کی منظمہ ایک معمر قاون ہوتی ہے۔ اس کا خطاب فرزندار قاون ہوتا ہے اور وہ خواجہ سراؤں کے سردار کی وساطت سے بیرونی دنیا سے تعلق رکھتی ہے یعنی محل سرا کے لیے تمام خرید و فروخت اسی کے ذریعے سے کرتی ہے۔‘

مولانا محمد انشا اللہ، سلطنت عثمانیہ کی موجودہ حالت اور اس کی باج گزار ریاستیں (امر تسر: مطبع اردو بازار 1397ھ)، ۲۔

۱۳۔ لیلی احمد، عورت، جنسی تفریق اور اسلام، مترجمہ خلیل احمد (لاہور: مشعل، ۱۹۹۴ء)،

۱۴۔ انجمن ترقی اردو ہند، مدیر، تاریخ قسطنطنیہ، جلد دوم (حیدرآباد: انجمن ترقی اردو ہند، سن)، ۲۴۸۔

۱۵۔ آچاریہ چانکیہ، ارتھ شاستر، ۹-۵۸۔

۱۶۔ سلاطین باب ۱۱، آیت ۳۔

۱۷۔ شورش کاشمیری، اس بازار میں، ۵۸۔

۱۸۔ ضیال الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی (رام پور: رضالا بیری، ۲۰۱۳ء)، ۲۹۔

۱۹۔ ابوالقاسم فرشتہ، تاریخ فرشتہ، مترجمہ عبدالحی خواجہ، جلد اول، (دیوبند: مکتبہ لیمیٹڈ دیوبند، سن)، ۸۳۸۔

۲۰۔ تبسم کاشمیری، اردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ تک (لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز، ۲۰۰۲ء)، ۱۵۹۔

21. “This arrangement of the Mughal harem with the three distinct Classes of women legal wives, free inferior wives and the concubines was an institution of the Mughal family that had prevailed at least from the time of Timur.” Bano, Shadab. “MARRIAGE AND CONCUBINAGE

IN THE MUGHAL IMPERIAL FAMILY.” *Proceedings of the Indian History Congress* 60 (1999): 356. <http://www.jstor.org/stable/44144101>.

۲۲۔ ڈاکٹر مبارک علی نے لکھا ہے: ’ہر بیوی کا علیحدہ کمرہ اور علیحدہ ملازم ہوتے تھے جن کی تعداد 10 سے 100 تک ہوتی تھی۔ شوہر ہر ایک کو ماہانہ خرچہ زیورات اور کپڑے دیتا تھا۔ ان کا کھانا باورچی خانہ سے آتا تھا۔۔۔ ہر رات وہ ایک بیوی کے ساتھ گزارتا تھا۔ اکثر امراء شراب پیا کرتے تھے۔ اگر اسے کوئی خوبصورت خواص یا کنیز پسند آجاتی تو اس کے ساتھ رات گزارتا تھا۔۔۔ بعض امراء اپنے محل میں بہت سی عورتیں جمع کر لیتے تھے جیسے مرزا عزیز کہ جس کی ایک ہزار پانچ سو بیگمات تھیں جن سے اس کے چار ہزار بچے ہوئے۔ اسماعیل قلی خان اکبر کے عہد کا ایک امیر تھا اس کے حرم میں ایک ہزار دو سو عورتیں تھیں۔ جب وہ دربار میں جاتا تو ان کے کمر بندوں پر مہر لگا کے جاتا تھا۔ راجہ مان سنگھ ایک ہزار پانچ سو عورتیں رکھتا تھا ہر ایک سے دو یا تین بچے تھے۔‘ ڈاکٹر مبارک علی، مغل دربار، ۳۲-۱۳۱۔

23. During the time of later Mughals, it became a fashion to patronise a prostitute. The literary writings of the time Make frequent references to prostitution, thus, showing the popularity This institution had gained in the society. Sudha Sharma, *The Status of Muslim Women in Medieval India* (Los Angeles: SAGE, 2016), 73.

۲۳۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے لکھا ہے:

’ان کی محل سراہیں جنس کے نگار خانے بنتی گئیں اور یوں Erotic culture لکھنؤ کے پورے ماحول پر ایک جنسی ثقافت کی چھاپ نظر آنے لگی۔ شجاع الدولہ اور ان کے جانشین اپنی محل سراؤں کو حسین عورتوں سے آباد رکھتے تھے۔ اودھ کے حکمرانوں کی ذاتی دلچسپی اور ذوق و شوق کے سبب اودھ کی جنسی تہذیب کو بہت فروغ ملا تھا۔ نواب شجاع الدولہ کی جنسی زندگی انتہائی طور پر غیر معمولی تھی۔ شجاع الدولہ جنون شہوت Erotomania کا شکار تھا۔‘ تبسم کاشمیری، اردو ادب کی تاریخ، ۳۸۹۔

۲۵۔ ’واجد علی شاہ نے ڈیڑھ سو حسین عورتوں کو منتخب کر کے ان کے لیے موافق داستانوں اور افسانوں کے پریوں کا سالباں اور زیور بنوایا ہے اور ان کے نازنین بازؤں پر جڑاؤ پر لگا کے بالکل پریاں بنایا ہے اور نام بھی ہر ایک کا پریوں کی طرح رکھا ہے پھر تعلیم رقص و سرود سے ان کے جمال کو باکمال کیا ہے۔ اور ان پریوں کے مناسب حال بعض مردان کچیم و شیم کو دیو بنایا ہے اور ان کو ہر وقت ناچنے گانے کی نقالی پر مقرر کیا ہے۔ اور اس سارے مجمعے کا نام رہس رکھا ہے۔‘ نجم الغنی رام پوری، تاریخ اودھ (لکھنؤ: منشی نول کشور ۱۹۱۹ء)، ۲-۹۱۔

۲۶۔ شرر نے لکھا ہے: ’بادشاہ شعیہ تھے اور شیعوں کی شرع میں متعہ بغیر کسی تحدید اور روک کے جائز ہے۔ اس مذہبی آزادی سے فائدہ اٹھا کے بادشاہ جی بھر کے اپنا شوق پورا کر لیتے اور قاعدہ یہ تھا کہ غیر متعہ عورت کی صورت تک دیکھنا گوارا نہ کرتے۔۔۔ اسی طرح موسیقی کا شوق بھی متوعات ہی تک محدود رہتا۔ شاذ و نادر ہی اس کا اتفاق ہوا ہو گا کہ بادشاہ نے کسی بازاری طوائف کا مجرا دیکھا ہو۔ خود

ممتوعات کی مختلف پارٹیاں بنادیں گئیں جن کو مختلف طرز پر رقص و سرور کی تعلیمیں دی جاتیں۔۔۔۔۔ یہ بیسیوں گروہ تھے جن کو رقص و سرور کی اعلیٰ تعلیم دی گئی اور انھیں کے ناچ گانے میں ان کا دل بہلتا۔ ان سب سے متعہ ہو گیا تھا، بیگمیں کہلاتی تھیں۔ عبدالحلیم شرر، گزشتہ لکھنؤ (نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۷۱ء) ۳-۱۱۲۔

۲۷۔ نیاز فتح پوری، ترغیبات جنسی (لکھنؤ: نگار بک ایجنسی، ۱۹۴۱ء)، ۲۳۔

۲۸۔ اردو ناول میں عورت کی گھریلو زندگی کے تجزیے کے لیے دیکھیے:

فہمیدہ کبیر۔ اردو ناول میں عورت کا تصور: نذیر احمد سے پریم چند تک (نئی دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۹۲ء)؛ ڈاکٹر فخر الکریم صدیقی، اردو ناول میں خاندانی زندگی (الہ آباد: ڈاکٹر فخر الکریم صدیقی، ۱۹۹۴ء)؛ ڈاکٹر عقیلہ جاوید، اردو ناول میں تانہیت (ملتان: بہا الدین یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء)؛ صغریٰ مہدی، اردو ناول میں عورت کی سماجی حیثیت (نئی دہلی: سجاد پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۲ء)؛ سمیرا عمر، ”اردو ناول میں عورت کی سماجی پیش کش (مقالہ برائے پی ایچ ڈی، یونیورسٹی آف سرگودھا، ۲۰۲۱ء)

۲۹۔ نذیر احمد، محسنات (دہلی: دارالاشاعت، ۱۸۸۵ء)، ۲۰۶۔

۳۰۔ ایضاً، ۱۸۳۔

۳۱۔ خدیجہ مستور، آنگن (نئی دہلی: ماڈرن پبلشنگ، ۱۹۸۴ء)، ۱۵۔

۳۲۔ اسلوب احمد انصاری، اردو کے پندرہ ناول (علی گڑھ: یونیورسٹی بک ہاؤس، ۲۰۰۳ء)، ۱۴۷۔

۳۳۔ قرآن العین حیدر، آگ کا دریا، (دہلی، اردو کتاب گھر، ۱۹۸۴ء)، ۲۱۷۔

34. Heidi Rika Maria Pauwels, *The Voice of the Indian Mona Lisa: Gender and Culture in Eighteenth-Century Rajasthan* (Cambridge: Cambridge University Press, 2023), 2.

۳۵۔ شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سر آسماں (جہلم: جہلم بک کارنر، ۲۰۲۰ء)، ۱۵۸۔

۳۶۔ ایضاً، ۴-۱۶۳۔

۳۷۔ ایضاً، ۱۶۹۔

۳۸۔ ایضاً، ۲۱۴۔

۳۹۔ ایضاً، ۴-۳۶۳۔